© rasailojaraid.com

ایمان اور اسلام

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ

برصغیر ہند و پاک کے مشہور عالم دین، فکر فراہی کے ترجمان اول اور اس صدی کے عظیم مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے خاص طور پر ہماری گذارش پر یہ مضمون مجلہ علوم القرآن کے لئے ارسال فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ موصوف کا سایہ تادیر قائم رکھے اور امت کو ان کے افکار عالیہ سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع ملے۔ مجلہ علوم القرآن میں انشاء اللہ مولانا محترم کے افادات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ (م۔م)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی جامع تعبیر ایمان اور اسلام کے دو لفظوں سے کی گئی ہے۔ یہ دونوں لفظ اگرچہ عام استعمال میں ایک دوسرے کے قائم مقام کے طور پر بھی آتے ہیں۔ اس لئے کہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ حقیقی ایمان کے لئے لازم ہے کہ اس کے ساتھ اسلام بھی پایا جائے۔ اسی طرح حقیقی اسلام کے لئے شرط ہے کہ اس کے ساتھ ایمان بھی ہو۔ اگر ایمان موجود نہ ہو اور اسلام کا دعویٰ کیا جائے تو وہ منافقانہ اسلام ہے جس کا حقیقت کی میزان میں کوئی وزن نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر کوئی ایمان کا مدعی ہے۔ لیکن اسلام سے عاری ہے تو اس کا دعوائے ایمان محض ادعا ہے جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں۔

ایمان اور اسلام لازم و ملزوم ہیں

اس اشتراک اور لزوم کے باوجود دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ ایمان کا تعلق اصلاً ان بنیادی عقائد اور اساسی کلیات کے اعتقاد و اقرار سے ہے جن سے دین کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں اور اسلام کا اطلاق اصلاً ان عبادات، احکام اور قوانین کی اطاعت اور فرماں برداری پر ہوتا ہے جو ایمان کے مقتضیات کے طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کی طرف سے دیئے گئے

...یں۔ اس پہلو سے کہہ سکتے ہیں کہ ایمان کا تعلق عقائد سے اور اسلام کا تعلق اعمال سے ہے۔ لیکن ...ن کے درمیان یہ فرق محض علمی دائرہ میں ہے۔ ایک مومن کی زندگی میں یہ دونوں باہم مل کر وجود پذیر ہوتے ...یں اور اسی وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک یہ باہم مربوط رہیں۔ اگر ان میں جدائی ہو جائے تو دونوں ...ی باہم معدوم ہو جاتے ہیں۔

...یک عام غلط فہمی کا ازالہ:

اس زمانے میں لوگوں کے اندر یہ گمراہی بہت عام ہے کہ وہ نجات کے لئے صرف چند باتوں ...مان لینا کافی سمجھتے ہیں۔ اعمال و اخلاق کو کوئی اہمیت نہیں دیتے یا اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ اس ...ر نجات کو منحصر سمجھیں۔ یہ گمراہی پہلے صرف چند فرقوں میں محدود تھی، لیکن اس زمانے میں وہ ہماری ...ثریت کا دین بن گئی ہے، یہاں تک کہ اب اس کے خلاف کچھ کہنا بھی آسان نہیں رہا۔ افسوس ...ہے کہ یہ بات جتنی ہی عام اور مقبول ہے اتنی ہی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے خلاف ...ہے۔ قرآن میں 'آمَنُوْا' کے ساتھ 'وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' اس اہتمام و التزام کے ساتھ آتا ہے کہ ...علوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ہر مومن کے ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس سے ...مال صالحہ وجود پذیر ہوں، مثلاً فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط	مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھیں جو نماز کا اہتمام کریں اور اس مال میں سے جو ہم نے ان کو بخشا ہے، خرچ کریں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

(الانفال۔ ۸: ۲-۴)

قرآن نے ایمان کو ایک ایسے مثمر درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری ...ی ہوئی اور اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں اور وہ برابر ہر موسم میں ثمر باری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کررہا ہو:

الم تر کیف ضرب اللہ مثلا	کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان
کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ	فرمائی ہے اللہ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرہ طیبہ کی
اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء	مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور
تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا	جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا
	پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے۔

(ابراہیم ۱۴: ۲۴-۲۵)

آیات میں کلمۂ طیبہ سے مراد ظاہر ہے کہ کلمۂ ایمان ہے۔ اس کی تمثیل اللہ تعالیٰ نے ایک
ایسے ثمر بار درخت سے دی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضا میں خوب
پھیلی ہوئی ہوں اور وہ برابر ہر موسم میں، اپنے رب کے فضل سے ثمر باری کر رہا ہو۔ زمین میں جڑوں کے
گہرے اترنے سے مقصود فطرتِ انسانی کے اندر اس کا رسوخ و استحکام ہے کہ وہ گھورے پر اگے ہوئے
پودے کے مانند نہیں ہے جس کی کوئی جڑ نہ ہو۔ حوادث کا کوئی معمولی سا جھونکا بھی اس کو اکھاڑ
پھینکے جیسا کہ کلمۂ کفر کی بابت فرمایا ہے کہ اجتثت من فوق الارض ما لھا من قرار" (ابراہیم ۱۴: ۲۶)
(جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے، اسے ذرا بھی ثبات حاصل نہ ہو) بلکہ وہ ایک تناور درخت
کے مانند اتنی پائیدار اور گہری جڑیں رکھتا ہے کہ اگر اس پر سے طوفان بھی گذر جائیں جب بھی وہ ذرا متاثر
نہ ہو۔ پھر اس کی فیض بخشی اور ثمر باری کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ ٹھونٹھ درخت کی مانند نہیں ہے کہ جس
سے نہ کسی کو سایہ حاصل ہو نہ پھل، بلکہ اس کی فضا میں پھیلی ہوئی سایہ دار شاخوں کے سایہ میں قافلے
آرام کرتے اور ہر موسم میں اس کے پھلوں سے غذا اور آسودگی حاصل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ ان
فیوض و برکات کی طرف ہے جو ایک صاحبِ ایمان کے ایمان سے خود اس کی زندگی اور اس کے توسط
سے ان لوگوں کی زندگیوں پر مترتب ہوتے ہیں جو اس سے کسی نوعیت سے قرب کا شرف حاصل کرتے
ہیں۔ یہ فیوض و برکات لازماً علمی اور عملی، دونوں ہی قسم کے ہوتے ہیں جو اس کے ایمان کی شہادت دیتے
ہیں اور ان سے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف رفعت و سرفرازی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل	اسی کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور عملِ
الصالح یرفعہ	صالح اس کلمہ کو سہارا دیتا ہے۔

(فاطر ۳۵: ۱۰)

اس آیت پر تدبر کیجئے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہو گی کہ کلمۂ ایمان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف صعود

فطری صلاحیت مضمر ہے، لیکن وہ اس کے لئے سہارے کا محتاج ہے۔ جو اس کو عمل صالح سے حاصل
تا ہے۔ گویا اس کی مثال انگور کی بیل کی ہے، جس کے اندر فضا میں بلند ہونے، پھیلنے اور پھل پھول دینے
صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن اس کی یہ صلاحیت بروئے کار اس وقت آتی ہے جب اس کو کسی ٹٹی اور چھپر
سہارا حاصل ہو جائے۔ اگر یہ سہارا نہ حاصل ہو تو وہ اپنی جگہ ہی پر سکڑ کر رہ جاتی اور اس کی تمام صلاحیتیں
جھا جاتی ہیں۔

اسی وجہ سے حقیقی ایمان کے ثبوت کے لئے ضروری ہوا کہ رسول کی کامل اطاعت یا بالفاظِ دیگر کامل
سلام کی عملاً شہادت دی جائے۔ اگر کوئی شخص ایمان کا مدعی ہو اور وہ اپنے عمل سے یہ شہادت نہ فراہم کر سکے
للہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی ذات کی قسم کھا کر اس کے ایمان کی نفی کی ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ جو
نے اسلام کی شہادت نہ پیش کر سکے اس کے ایمان کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے:

فلا و ربک لا یؤمنون حتی یحکموک	پس نہیں، تیرے رب کی قسم، یہ لوگ مومن
فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا	نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تمہیں حکم
فی انفسھم حرجا مما قضیت	نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس پر اپنے دلوں میں
و یسلموا تسلیما	کوئی تنگی محسوس کئے بغیر اس کے آگے سر تسلیم
	خم نہ کر دیں۔

(النساء ۴: ۶۵)

اس آیت میں خطاب ان منافقین سے ہے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر
ان کے مدعی تو بن بیٹھے تھے لیکن ان کے روابط مدینہ کے آس پاس کے ان یہودی قبائل سے بھی تھے
ن کو ابھی مدینہ کی حکومت پوری طرح مستحکم نہ ہونے کے سبب سے اپنے اپنے حدود میں کچھ سیاسی قوت
اصل تھی۔ چنانچہ یہ منافقین اپنے مقدمات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لانے کے بجائے
ان کی عدالت میں اس توقع سے لے جاتے کہ رشوت اور سفارش کے ذریعہ ان سے اپنے منشاء کے
طابق فیصلہ حاصل کر سکیں۔ ان کی نسبت قسم کھا کر فرمایا کہ ان کا دعوائے ایمان محض لاف زنی ہے۔
ان کا عمل ان کے ایمان کے خلاف ہے۔ ان کے ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ یہ رسول کو اپنی زندگی
ے معاملات میں حکم مانیں اور بے چون و چرا اس کے فیصلوں کی اطاعت کریں۔ اس اسلام کے بغیر ان
ایمان معتبر نہیں۔

یہی حقیقت دوسرے الفاظ میں یوں واضح فرمائی گئی ہے:

انما المؤمنون الذین امنوا باللہ و رسولہ	مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات ۴۹:۱۵)	پر ایمان لائے پھر شک میں نہیں پڑے اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

ایمان اور اسلام جامد نہیں ہیں:

ایمان اور اسلام کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھئے کہ یہ جامد اور غیر نامی نہیں ہیں، بلکہ ان میں دیبا
اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ اگر ان کی پرورش و پرداخت کی جائے اور یہ مضمحل، بلکہ مردہ اور بے جان ہو جا
ہیں اگر ان کی دیکھ بھال نہ کی جائے۔ دنیا کی دوسری نامی اور ذی حس چیزوں میں قدرت کا جو قانون جا
ہے وہی قانون ان میں بھی کارفرما ہے۔ ان لوگوں کے ایمان اور اسلام میں برابر افزونی اور برکت ہوتی رہتی
جو اس کائنات میں تفکر کرتے اور اس کے اندر اس کے خالق کی شانوں، اس کی قدرتوں، اس کی حکمت
اور اس کی رحمت و ربوبیت کے عجائب کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو ان قوانین و سنن پر نگاہ رکھتے ہیں جو ا
دنیا میں جاری ہیں اور جو ایسے بے لاگ اور اٹل ہیں کہ نہ کبھی ان کے ظہور میں تخلف ہوتا اور نہ وہ کبھی جا
داری برتتے۔ جو اپنی روزمرہ زندگی میں اپنے رب کے تمام چھوٹے بڑے احکام پر عمل کرتے اور اس کی رحمتو
اور برکتوں کا تجربہ کرتے ہیں۔ جو اس کے صبر و شکر کے امتحانوں سے گذر کر ہر امتحان کے بعد ایک نئی زند
اور نیا عزم و حوصلہ حاصل کرتے ہیں۔ اور خاص طور پر ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں یہ افزونی سے
زیادہ ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب میں برابر تدبر کرتے ہیں اور ان کی زبانوں پر دل کی گہرائیوں سے
دعا جاری رہتی ہے کہ "انی اسئلک بکل اسم ھولک سمیت بہ نفسک او انزلتہ فی کتابک
او علمتہ احدا من خلقک ان تجعل القرآن ربیع قلبی و نور صدری وجلاء حزنی وذھاب
ھمی وغمی"[1] (اے رب! میں تیرے ہر اس نام سے جو تیرے لئے ہے، جس سے تو نے اپنے کو موسوم کیا
ہے یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے درخواست کر

---

[1] مسند احمد بن حنبل: ج۔ ۱: ۳۹۱، ۴۵۲۔ البتہ اس کے اصل الفاظ ہیں:
اللھم إنی عبدک بن امتک ناصیتی بیدک ماض فیّ قضائک اسالک بکل اسم ھولک سمیت
بہ نفسک او علمتہ احدا من خلقک او انزلتہ فی کتابک او استأثرت بہ فی علم الغیب عند
ان تجعل القرآن ربیع قلبی و نور صدری وجلاء حزنی وذھاب ھمی "الخ (م۔م)

ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینہ کا نور، میرے غم کا مداوا اور میری فکر و پریشانی کا علاج
(دے)۔

ان کے بعد ان لوگوں کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہی جو ان اوصاف سے محروم ہیں۔ ظاہر ہے
جو لوگ اپنے ایمان و اسلام کو تازہ و شاداب رکھنے کے لئے اس قسم کا کوئی اہتمام نہیں کریں گے جس
طرف اوپر اشارہ ہوا، ان کا ایمان و اسلام دیکھ بھال سے محروم ہونے کے سبب سے جلد فنا ہو جائے
اس کی مثال اس پودے کی ہے جو اتفاق سے ان کے صحن میں اگ تو پڑا، لیکن نہ تو اس کو کبھی پانی اور
دکی شکل دیکھنی نصیب ہوئی، نہ کبھی اس کی گڑائی ہوئی اور نہ کبھی اس کو ناموافق ہواؤں اور اس کو تباہ
نے والی بیماریوں سے بچانے کی کوشش کی گئی۔

اس باب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت، جو اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے، وہ یہی ہے کہ وہ
ن بخشنے کو تو بہتوں کو بخش دیتا ہے، لیکن یہ پروان انھیں کے اندر چڑھتا ہے جو اس کی قدر کرتے اور
ن کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ یہ قاعدہ کلیہ ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم ۱۴: ۷)	اور یاد کرو جب تمہارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم میری نعمت کے شکر گذار رہے تو میں اس میں بڑھوتری بخشوں گا۔

کسی نعمت کی صحیح شکر گذاری یہ ہے کہ اس کی دل سے قدر کی جائے اور اس کا حق صحیح صحیح ادا کیا جائے۔
س کا حق نہ ادا کیا جائے تو آدمی نہ صرف اس کے نفع سے محروم ہو جاتا ہے، بلکہ سیدنا حضرت مسیح
اسلام کے ارشاد کے بموجب وہ اس کی اصل سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے ایمان و اسلام میں اللہ تعالیٰ خاص
پر افزونی بخشتا ہے جو ان شدائد و مصائب کے مقابل میں اپنے ایمان اور اسلام پر ثابت قدم رہتے
، جو اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق، اس کے ایمان و اسلام کی آزمائش ہی کے لئے ظہور میں آتے
۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں وہ یوں ہی چھوڑ نہیں دیے جاتے،
ہ مختلف قسم کے چھوٹے بڑے امتحانوں میں ڈال کر پرکھے جاتے ہیں کہ ان کے دعوے میں کچھ صداقت
یا وہ محض زبان کے غازی ہیں۔ اس امتحان میں اگر وہ فیل ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے دفتر سے
نام مومنوں کی فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اگر وہ مشکلات کا مقابلہ کر کے اپنے ایمان پر ثابت
رہنے کا حوصلہ کرتے ہیں تو اس کی طرف سے اس جدوجہد کے لئے بھی قوتِ ایمانی کا بدرقہ عنایت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا ہے اور امتحان میں کامیابی کے بعد امتحان کے درجہ اور کامیابی کی نوعیت کے اعتبار سے ان کے ایمان
بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے ۔ اس سنت الٰہی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے :

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (العنکبوت ۲۹ : ۲)	کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے ۔

اس امتحان میں ثابت قدمی دکھانے والوں کی اللہ تعالیٰ جس طرح مدد کرتا ہے اس کی طرف
اشارہ فرمایا ہے:

اِنَّھُمْ فِتْیَۃٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّھِمْ وَزِدْنٰھُمْ ھُدًی (الکہف ۔ ۱۸ : ۱۳)	یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں مزید افزونی عطا فرمائی ۔

یہ آیت اصحابِ کہف کے ذکر کے سلسلہ میں اس مقام پر آئی ہے جب ان کی قوم نے ا
یہ دھمکی دی ہے کہ وہ اگر اپنی دعوتِ توحید سے باز نہ آئے تو لازماً سنگسار کر دیے جائیں گے ۔ قوم کے ا
فیصلہ سے مرعوب ہو کر اپنا دین چھوڑنے کے بجائے انھوں نے اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کا ع
بالجزم کیا اور اپنے رب سے دعا کی کہ اے رب اب آگے کے مراحل میں راہ کھولنے والا تو ہے ۔
کی اس عزیمت اور اس دعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قوتِ ایمانی میں اتنا اضافہ کر دیا کہ د
مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے پوری طرح اہل ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی وہ شانیں ان کے لئے
ہوئیں جن کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا ۔

یہی جوشِ ایمان سچے مسلمانوں کے اندر اس وقت اُبلتا جب منافقین ان کو یہ ڈراوا
سناتے کہ دشمنوں کی تمام قوتیں تمہیں فنا کر دینے کے لئے مجتمع ہو رہی ہیں تو یہ چیز ان کو مرعو
اور دہشت زدہ کرنے کی بجائے ان کے ایمان کو اور زیادہ بڑھانے والی بنتی ۔ فرمایا ہے :

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا ق ۔ (آل عمران ۳ : ۱۷۳)	منافقین اہلِ ایمان کو ڈراتے ہیں کہ دشمن نے تمہارے لئے بڑی طاقت اکٹھی کی ہے

اس سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا ۔
اہلِ ایمان کی یہ خصوصیت قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ جب اعداء ان کے ایمان کی راہ میں
روڑے اٹکاتے ہیں تو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے قوت خود ان کے ایمان ہی کے سرچشمہ سے
ملتی ہے ۔ رکاوٹوں کے مقابل میں اہل ایمان کا عام حال یہ بیان ہوا ہے :

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّھُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ (التوبہ ۹ : ۱۲۴)	سو جو سچ مچ ایمان لائے ہیں ۔ وہ ان کے لئے ایمان میں اضافہ کرتی ہے اور وہ اس سے بشارت حاصل کرتے ہیں ۔

یعنی منافقین جن باتوں سے ڈرتے اور دوسروں کو ڈراتے ہیں وہی باتیں اہلِ ایمان کے ایمان اور
ان کے عزم و حوصلہ کو بڑھاتی ہیں ۔ ع

تفاوت است میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

اہلِ ایمان کے اس کردار کی طرف یہ آیت بھی اشارہ کرتی ہے :

وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَمَا زَادَھُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ط (الاحزاب ۳۳ : ۲۲)	(اہلِ ایمان کہتے ہیں کہ) اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا ، وہی باتیں پیش آ رہی ہیں جو پہلے بتائی گئیں تھیں) اس چیز نے ان کے ایمان و اطاعت ہی میں اضافہ کیا ۔

ایک ضروری تنبیہ :

یہاں ایک تنبیہ بہت ضروری ہے وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ ایمان کے گھٹنے یا بڑھنے کے قائل نہیں تھے ۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ ہمارے اس دعوے کے خلاف پڑتی ہے جو ہم نے اوپر کی سطروں میں پیش کیا ہے ۔ ہمارا خیال ہے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات کا کوئی خاص محل ہوگا جس کی طرف لوگوں کی نظر نہیں گئی ہے ۔ ورنہ ایک جلیل القدر امام ایک ایسی بات کس طرح فرما سکتے ہیں جو بظاہر قرآن اور حدیث ، دونوں کے خلاف نظر آتی ہے ۔
امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات کا صحیح محل یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو قانونی اور فقہی ایمان سے متعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مانیے۔ قانون صرف ظاہر سے بحث کرتا ہے، کسی شے کی حقیقت اور اس کے کیف وکم سے بحث کرنا اس کے
مقصد سے خارج بھی ہے اور اس کے دائرۂ امکان سے باہر بھی۔ اس کے نزدیک ہر وہ شخص جو چند معلوم
کا اقرار اور چند معروف رسوم کو ادا کرتا ہے مومن اور مسلم ہے۔ اس امر سے اس کو کچھ بحث نہیں کہ وہ جن
اقرار کرتا ہے ان کو دل سے مانتا اور ان کا یقین بھی رکھتا ہے یا محض زبان سے ان کا اقرار کرتا ہے۔ اسی طرح وہ جن
رسوم پر عمل کرتا ہے محض ظاہر دارانہ کرتا ہے یا اس کے اندر کچھ صدق واخلاص بھی ہوتا ہے۔ یہ سوالات ا
کے مقصد سے غیر متعلق بھی ہیں اور ان کی تحقیق کا ان کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ اس کا اصل کام
اسلامی سٹیٹ کے شہریوں کے لئے ایک معیار متعین کرنا ہے جس کو سامنے رکھ کر وہ ان نزاعات اور ان کے
حقوق کا فیصلہ کرسکے۔ ظاہر ہے کہ یہ معیار سب کے لئے یکساں ہوگا اور اس کے تعین میں صرف وہی چیزیں کام
دے سکتی ہیں جو بالکل ظاہر ہوں۔ وہ چیزیں ان میں کام دینے والی نہیں بن سکتیں جن کا تعلق باطنی کیفیات
اور حقائق سے ہے۔

اس پہلو سے غور کیجئے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا ایک عمدہ محل مل جائے گا۔ ان کی
بات نہ قرآن وحدیث کے خلاف محسوس ہوگی نہ ہمارا مسلک ان کے مسلک سے متصادم ہوگا۔ اس طرح
کی بعض اور باتیں بھی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہیں جو بظاہر قرآن وحدیث کے خلاف معلوم ہوتی ہیں
حالانکہ وہ اپنے اصل مقام میں بالکل صحیح ہیں لیکن لوگوں نے ان کے موقع کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

اسلام کے کامل نمونہ:

اسلام کے کامل نمونہ کی حیثیت سے قرآن نے سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسمٰعیل علیہما السلام کا ذکر
کیا ہے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ لازماً وہ ایمان کے بھی نمونۂ کامل ہیں۔ ہم مضمون کی تمہید میں
اس حقیقت کی طرف اشارہ کرچکے ہیں کہ ایمان واسلام دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ان میں افتراق صرف اس صورت
میں ہوتا ہے جب یہ صرف ظاہراً پائے جاتے ہوں۔ حقیقۃً پائے جانے کی صورت میں ان میں افتراق ممکن نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کامل نمونۂ اسلام کی حیثیت سے پیش کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ
اسلام کے امتحان میں انھوں نے جو شاندار کامیابی حاصل کی وہ تنہا انہی کا حصہ ہے۔ اس آسمان کے نیچے کسی
کو اللہ تعالیٰ نے اس امتحان میں نہیں ڈالا۔ صرف انہی کو ڈالا اور خود اللہ تعالیٰ نے تصدیق فرمائی ہے کہ
آپ نے سو فی صد کامیابی حاصل کی۔

اسلام کی تعبیر عام طور پر 'گردن نہادن بطاعت' سے کی جاتی ہے۔ یہ تعبیر بالکل مطابق حقیقت

ہے۔ جس نے اپنا سب کچھ اپنے رب کے حکم پر قربان کردینے کے لئے اپنے کو تیار کرلیا وہ مسلم ہے ایک
مسلم کا شعاری کلمہ: اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (میری نماز اور میری قربانی
میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کیلئے ہے (الانعام ۶: ۱۶۲) ہے۔ سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسماعیل علیہما السلام نے
عملی زندگی سے اس کی شہادت دی اس وجہ سے وہ اسلام کے کامل مظہر قرار پائے۔ وہی ہیں جنہوں نے اپنے
لئے مسلم بنائے جانے کے ساتھ اپنی ذریت میں بھی ایک امتِ مسلمہ برپا کرنے کی دعا کی:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ	اے ہمارے رب! ہم دونوں کو تو اپنا فرمانبردار
وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً	بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی ایک
لَّکَ ص	فرماں بردار امت اٹھا۔

(البقرہ ۲: ۱۲۸)

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اس کی قبولیت کے نتیجہ میں سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی ذریت
میں خاتم الانبیاء، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی جو ایک عظیم امتِ مسلمہ کے داعی اور مؤسس ہوئے
سیدنا ابراہیم نے جس امت کا نام امتِ مسلمہ، اپنی دعا میں تجویز کیا تھا، جب اس کی بعثت ہوئی تو اس کا نام
امتِ مسلمہ رکھا گیا۔ اس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ ہے:

هُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۵ۙ مِنْ قَبْلُ	اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے
وَفِیْ هٰذَا (الحج ۲۲: ۷۸)	اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام مسلم ہے۔

یہ بات بھی یہاں یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ کا اصل دین، اسلام ہی ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ
الْاِسْلَامُ (آل عمران ۳: ۱۹) (اللہ کا اصل دین اسلام ہے) سیدنا ابراہیم علیہ السلام اسی دین پر تھے۔ دوسرے
اسلام کے سوا جو اختراع کئے گئے وہ بدعت کی راہ سے اختراع کئے گئے۔ یہ امت ـــــ امتِ مسلمہ
ـــــ دنیا میں اس لئے برپا کی گئی کہ اسلام کے نام اور اس کی روح، دونوں کی حامل بنے۔

اللّٰھم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہ

ضروری اعلان

تبصرے کے طالب کتاب کے دو نسخے ارسال کریں۔ جس کتاب کا صرف ایک نسخہ موصول ہوگا
مجلہ علوم القرآن میں اس پر تبصرہ شائع نہ ہوسکے گا۔ (مینجر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن مجید کی معنوی تفسیر

بطن القرآن

مولانا محمد فاروق خاں
ایم۔اے

قرآن مجید میں زندگی کے لئے کچھ بنیادی عقائد و نظریات اور ظاہری احکام اور ضوابط ہی بیان نہیں ہوئے ہیں بلکہ قرآن میں بعض ایسے لطیف حقائق و معانی بھی بیان کئے گئے ہیں جن کے ادراک کے لئے حد درجہ حساس دل اور حساس ذہن و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حقائق و معانی ایسے ہیں جن سے خود ہماری فطرت کی عمیق ترین حسیات کی ترجمانی ہوتی ہے جن کی طرف سے عام حالات میں ہم بالکل غافل ہوتے ہیں۔ پھر قرآن صرف یہی نہیں بلکہ ہمیں ہمارے بہترین جذبات اور ہماری فطرت کے لطیف ترین تقاضوں سے آشنا کرتا ہے بلکہ وہ اس سلسلہ میں بھی ہماری پوری رہنمائی کرتا ہے کہ ہماری فطرت کے تقاضے کیوں کر پورے ہو سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم اپنے اندرون اور اپنے روح کے تقاضوں سے واقف نہ ہوں خدا کی طاعت اور اس کی بندگی کا حق ہم ادا نہیں کر سکتے۔ جسم کو تو انسان بآسانی خدا کے آگے جھکا سکتا ہے لیکن جب تک روح بھی اس کے آگے سجدہ ریز نہ ہو نہ حق بندگی ادا ہوتا ہے اور نہ انسان صحیح معنی میں اپنے خالق کے خلاف سرکشی سے یکسر باز آسکتا ہے۔

جس طرح پھیلی ہوئی کائنات اپنے کشادہ دامن میں کتنی ہی دنیائے معانی چھپائے ہوئے ہے لیکن انسان اپنی بے خبری اور کوتاہ نگاہی کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ ٹھیک یہی حال قرآن کا ہے۔ قرآن ہمیں زندگی کے اعلیٰ مفہوم سے آشنا کرنا چاہتا ہے اس میں ہر جگہ ابدی حسن کی جلوہ گری ہے۔ ہر مقام پر وہ اسرار حیات اور اعلیٰ حقیقتوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرانی چاہتا ہے لیکن ہم چوک جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ ہماری زندگی نظر آنے والی چند سطحی چیزوں سے عبارت ہے اور نہ قرآن محض احکام و قوانین کا نام ہے۔ بلکہ جس طرح آدمی کی پہچان چہروں سے نہیں دلوں سے ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح قرآن کی عظمت کا اصل راز وہ حقائق اور اسرار ہیں جو بطن قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن کے اپنے بیان اور اظہار مدعا میں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا پھر بھی اگر ہماری حس تیز نہیں

اور ہم فکر و تدبّر سے کام نہ لیں تو قرآن کے کتنے ہی ایسے اہم مقامات سے ہم سرسری طور سے گذر جائیں گے جہاں معانی و معارف کی ایک وسیع کائنات دکھائی دیتی ہے، اس معاملہ میں قرآن ہماری پوری توجہ چاہتا ہے توجہ اور ذہن و قلب کی بیداری کے بغیر محرومی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ قرآن کہتا سب کچھ ہے لیکن اس کے کہنے کا ایک خاص اسلوب ہے جس میں جامعیت، ایجاز اور اختصار بیان کا خاص اہتمام پایا جاتا ہے۔ نازک ترین حقیقتوں کے بیان میں اختصار نہایت ضروری بھی تھا، زیادہ توضیح و تشریح معانی، اسلوب لطیف کے خلاف ہے۔ اس لئے ابہام نہ ہوکر بھی ایسے مقامات پر ایک قسم کے ابہام کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ لطیف و نازک باتوں کا تعلق چونکہ دل سے ہوتا ہے اور دل تک بات پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ کلام میں ایک طرح کی خاموشی بھی شامل ہو۔ ہمارے دل جن گیتوں کو اپنے میں جذب کر سکتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں جو لبوں پر آکر ادھورے ہی ختم ہو جائیں۔ اچھے کلام پھولوں کی طرح ہوتے ہیں جن کی قوت اپنے معنی بتانے میں صرف نہیں ہوتی لیکن ان کی خوشبو مشام جاں کو مسرور کر جاتی ہے۔

مفسرین قرآن نے قرآن کی مختلف تفسیریں لکھی ہیں۔ ان تفسیروں میں احکام و قوانین، روایات اور تاریخی پس منظر وغیرہ پر اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض میں منطق و فلسفہ اور علم کلام کے اثرات نمایاں ہیں لیکن قرآنی حکمت پر کم روشنی ڈالی گئی اور بہت کچھ اضافے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بعض بزرگوں نے عام احکام و قوانین سے ہٹ کر اگر کچھ لکھنے کی کوشش کی بھی ہے مثلاً تفسیر عرائس البیان جو علامہ محی الدین ابن عربیؒ کی طرف منسوب ہے تو بڑا نقص یہ پایا جاتا ہے کہ اس میں خیالات و احساسات خواہ کتنے ہی گہرے اور پاکیزہ کیوں نہ ملتے ہوں لیکن بالعموم قرآن کے اپنے الفاظ ان خیالات کا ساتھ نہیں دیتے اس طرح ہم اسے تفسیر نہیں کہہ سکتے۔ جو کچھ اس میں ملتا ہے اس کی حیثیت علم اعتبار کی ہے۔ علم اعتبار کا مطلب یہ ہے کہ کچھ پڑھ کر یا سن کر آدمی کے ذہن میں بطور عبرت و نصیحت کچھ خاص باتیں آئیں جو نہ اس کا مدلول ہوں اور نہ اس کا مقصود جو کچھ کہ اس نے پڑھا یا سنا ہو۔ بعض روایات یا آثار میں ہمیں علم اعتبار کی اصل ملتی ہے اس لئے اسے صوفیار کی بدعت قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ دو آدمیوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ جو کچھ لوگ آج کل کر رہے ہیں اور اس کے لئے محنت و مشقت برداشت کر رہے ہیں کیا یہ وہ چیز ہے جو پہلے سے ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے اور ان کی تقدیر میں گذر چکی ہے یا یہ وہ چیز ہے جو آئندہ ہونے والی ہے اور جسے ان کا نبی لایا ہے اور حجت ان پر قائم ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ وہی چیز ہے جو ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اوران پر گذر چکی ہے۔ اور کتابِ الٰہی میں اس کی تصدیق موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰاهَا (والشمس: ۷-۸)

اور شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اسے سنوارا پس اس کی بدی اور پرہیز گاری اس پر الہام کر دی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان آیتوں میں مسئلہ تقدیر کا ذکر نہیں ہے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات کی تائید میں ان آیتوں کو کیوں پیش فرمایا۔ شاہ ولی اللہؒ صاحب نے لکھا ہے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم اعتبار کے طور پر تشبیہ دی ہے کہ جس طرح فجور و تقویٰ کا القاء ہوا ہے اسی طرح اعمال کو بھی مقدر کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کی دوسری احادیث بھی ہیں جن میں علم اعتبار کا استعمال پایا جاتا ہے، ان حدیثوں کا ذکر موجب طوالت ہوگا اس لئے ہم ان کو یہاں نقل نہیں کر رہے ہیں۔

بعض صحابہ کرامؓ سے بھی علم اعتبار کا استعمال منقول ہے۔ چنانچہ آیت

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا (الرعد: ۱۷)

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ندی نالے اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ آگئے

کی تفسیر میں ابن عباسؓ نے فرمایا:

یرید بالماء الشرع والدین وبالاودیۃ القلوب

یعنی یہاں پانی سے شرع اور دین اور اودیہ سے (بطور تشبیہ) قلوب مراد ہیں۔

اسی طرح ابن عباسؓ

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الرعد: ۱۷)

"خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی عطا کرتا ہے۔

کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "لین القلوب بعد موتها والا فقد علم احیاء الارض مشاهدة" یعنی یہاں ارض سے مراد مردہ قلوب ہیں کہ اللہ تعالیٰ مردہ قلوب کو زندہ کر دیتا ہے ورنہ زمین کا حال تو سبھی کو معلوم ہے۔ اس کی حالت بتانے کا اتنا اہتمام ضروری نہ تھا۔ ظاہر ہے یہ بھی علم اعتبار ہی ہے لیکن اس سے تفسیر مشہور و معروف کی نفی کرنی مقصود نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اس آیت سے ظاہری مدلول پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس سے قلوب کی حالت کی طرف انتقال کرنا چاہئے کیونکہ دلوں کی حالت بھی وہی ہے جو زمین کی حالت مشاہد ہے۔ اس طور پر جو عبرت و نصیحت حاصل ہوتی ہے وہ خواہ مدلول آیت نہ ہو لیکن وہ خود ایک مستقل

دلیل سے ثابت ہوتی ہے۔ یہی حقیقت ہے علم اعتبار کی۔ اہل حق صوفیاء آیاتِ قرآنی کے منقول معانی کے مدلول مفہوم و مقصود کے منکر نہیں ہیں۔

معنوی اعلیٰ حقائق جن کی تائید و تصدیق قرآن کے اپنے الفاظ سے بھی ہوتی ہے یعنی جو آیاتِ قرآنی کے منقول معانی کا مدلول مفہوم و مقصود ہوں وہ بڑے ہی قدر و قیمت کے حامل ہیں کیونکہ ان کے مستند ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کی ایسی تفسیر لکھی جائے جس میں اعلیٰ معنوی حقائق کو زیر بحث لایا جائے۔ عام باتیں جو تفسیر کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں گرچہ وہ مفید اور ضروری ہیں انھیں نظر انداز کیا جائے کیونکہ ان سے واقف ہونے کے لئے بہت سی کتابیں اور تفسیریں پہلے سے موجود ہیں۔ کاش کوئی صاحبِ علم و نظر یہ تفسیر لکھ سکتا۔ ہم اس سلسلہ میں حسب توفیق محض کچھ احساسات قارئین کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ کام بھی اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب کہ خدائے بزرگ و برتر کی مدد اور اس کا خاص فضل شامل حال ہو۔

اس وقت ہم سورۂ نور کی چند مشہور و معروف آیات کو غور و فکر کا موضوع بناتے ہیں۔ سورہ النور میں آیت:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے

کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ مومن کی زندگی خدا کے نور سے معمور اور روشن ہو خواہ وہ اس کی انفرادی زندگی ہو یا معاشرتی اور اجتماعی۔ چنانچہ سورہ النور میں اہلِ ایمان کے لئے اجتماعی و معاشرتی احکام بھی بیان ہوئے ہیں اور نہایت حکمت کے ساتھ اس جانب رہنمائی کی گئی ہے کہ کس طرح مومن کی اجتماعی و انفرادی زندگی میں نورِ حق کا ظہور ہوتا ہے اور کس طرح خدا کا نور سب کچھ اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔

حدیث سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ خَلْقَهٗ فِیْ ظُلْمَۃٍ فَاَلْقٰی عَلَيْهِمْ مِّنْ نُّوْرِهٖ فَمَنْ اَصَابَهٗ مِنْ ذٰلِكَ النُّوْرُ اهْتَدٰی وَمَنْ اَخْطَاهُ ضَلَّ (احمد والترمذی)

اللہ نے اپنی مخلوق کو تاریکی کی حالت میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور ڈالا۔ پس جس تک یہ نور پہونچا وہ ہدایت یاب ہوا اور جو اس سے چوک گیا وہ بھٹک گیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اصل میں نور الٰہی سے وابستہ ہے اور ضلالت کی حقیقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہے کہ انسان کی زندگی نورِ الٰہی کی حامل نہ بن سکے۔

سورہ نور کی مذکورہ آیت کا سلسلہ ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ
كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ
اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ
مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ
وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ
تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ
لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ
لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۙ ۝
فِىْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ
فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَ
الْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ
وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ
وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ
فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ لِيَجْزِيَهُمُ
اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ
مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ
بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ
كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ
مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ
شَيْــًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ
حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝
اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَّغْشٰهُ
مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی تمثیل ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے جس میں ایک چراغ ہے —— وہ چراغ ایک فانوس میں ہے، وہ فانوس ایسا ہے گویا چمکتا ہوا کوئی تارا ہے —— وہ چراغ ایک شاداب درخت زیتون کے روغن سے جلایا جاتا ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی، اس کا روغن آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہے، اگرچہ آگ اسے نہ بھی چھوئے، روشنی پر روشنی ہے —— اللہ اپنے نور کی ہدایت جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لئے تمثیلیں پیش کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز جانتا ہے۔

—— ان گھروں میں جن کو بلند کرنے اور جن میں اپنے نام کے ذکر کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ان میں ایسے لوگ صبح اور شام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنھیں اللہ کی یاد اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے نہ تجارت غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت۔ وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں مضطرب ہوں گے۔ تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا دے اور اپنے فضل سے انھیں مزید نوازے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ
لَمْ يَكَدْ يَرٰٮهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ
لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝

(النور: ۳۵-۴۰)

رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال چٹیل صحرا میں سراب کی طرح ہیں کہ پیاسا اسے پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اسے کچھ بھی نہ پایا۔ البتہ خدا کو اس کے پاس پایا، جس نے اس کا حساب پورا پورا چکا دیا، اور اللہ حساب جلد کرتا ہے۔ یا پھر جیسے ایک گہرے سمندر میں تاریکیاں موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہے، اس کے اوپر بادل ہے تہ بہ تہ تاریکیاں جمع ہیں، جب وہ اپنا ہاتھ نکالے تو وہ سجھائی دیتا معلوم نہ ہو۔ جسے اللہ نے روشنی نہ دی، اس کے لئے پھر کوئی روشنی نہیں۔

(نور: آیت ۳۵ تا آیت ۴۰)

اب ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان آیات کے بعض رموز کی طرف اشارہ کرنا چاہیں گے۔ قرآن جو کچھ کہتا ہے اس کی آفاقی حیثیت سے بھی ہم کو باخبر کرتا ہے۔ کیونکہ آفاقی صداقت کے بغیر حقیقی معنویت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ پہلی اور بنیادی حقیقت یہ بیان فرمائی گئی کہ "خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے"۔ کائنات کی ساری رونق اور دلکشی اور جاذبیت کی نمود اللہ کے نور کے سبب ہے کائنات کے گوشے گوشے میں جو ذات جاذبِ قلب و نگاہ بنی ہوئی ہے اس سے ناآشنا رہنا سب سے بڑی محرومی کی بات ہے۔ اس محرومی کا مطلب یہ ہے کہ ہم آسمان اور زمین کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھ سکے اور کائنات جو سب سے بڑا راز ہم پر کھولنا چاہتی ہے اس سے ہم ناآشنا رہے۔ کائنات اور اس کی ہر چیز اور اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں اس کے لئے وقف ہیں کہ ہم خدا کی عظمت اور اس کی محبوبیت سے واقف ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے قلوب خدا کے بجائے کسی اور کے آگے جھک رہے ہوں۔

اس کے بعد خدا نے اپنے نور کی تمثیل بیان فرمائی۔ اور بتایا کہ اس کا نور کس طرح قلب مومن میں جگمگاتا اور روشن رہتا ہے۔ مومن کے دل کو نہ صرف یہ کہ خدا کی ذات و صفات کی طرف رہنمائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ کسی اور چیز سے نہیں خدا کے نور سے معمور اور روشن رہتا ہے۔ خدا نے اپنے نور کی جو تمثیل پیش کی ہے وہ قلب مومن کے پیش نظر فرمائی ہے۔ اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ آگے فرمایا گیا ہے:

يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ — اللہ اپنے نور کی ہدایت جسے چاہتا ہے بخشتا ہے۔

اور مقابل کی تمثیلیں جو اہل کفر کے سلسلہ میں پیش فرمائی ہیں ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ایک تمثیل میں اگر نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ (روشنی پر روشنی) فرمایا تو مقابل کی تمثیل میں

ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ — تہ بہ تہ تاریکیاں جمع ہیں

ارشاد ہوا ہے۔ ایک تمثیل میں اگر يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی ہدایت بخشتا ہے) آیا ہے تو دوسری تمثیل میں وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (جسے اللہ نے روشنی نہیں دی اس کے لئے پھر کوئی روشنی نہیں) کہا گیا ہے۔

اسی طرح پہلی تمثیل میں اگر مَثَلُ نُوْرِهٖ (اس کے نور کی تمثیل) کے الفاظ آئے ہیں تو دوسری تمثیل میں وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۗ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا (رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال چٹیل صحرا میں سراب کی طرح ہیں کہ پیاسا اسے پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آیا تو اسے کچھ بھی نہ پایا) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اہل کفر کے اعمال اگر سراب محض یا تاریکیاں ہیں تو جو نور اور آرزو کی شے اہلِ ایمان کے حصے میں آئی ہے وہ ایسی نہیں ہے۔ جیسے تشنہ لب کے لئے سراب ہوتا ہے اور نہ وہ تاریکیوں کی طرح کوئی وحشت ناک چیز ہے۔ اس نور کا رشتہ مومن سے ایسا گہرا اور قریبی ہوتا ہے جیسا رشتہ اور تعلق آدمی کا اس کے اعمال کے ساتھ ہوتا ہے۔ حدیث قدسی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

"میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔ اور میں جب اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے

وہ چلتا ہے۔" (بخاری)

بعض روایات میں ان الفاظ کا اضافہ ہے:

وَفُؤَادَهُ الَّذِىْ يَعْقِلُ بِهٖ وَلِسَانَهُ الَّذِىْ يَتَكَلَّمُ بِهٖ (احمد، حاکم، طبرانی) — اور اس کا دل ہو جاتا ہوں جس سے وہ سمجھتا ہے اور اس کی زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ باتیں کرتا ہے۔

ـب خاص کی وجہ سے بندے کا ہر عمل خدا کی پسند اور اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ بندے کے اعمال ـتائے الٰہی کا اظہار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بات بندے کے لئے کس درجہ وجد انگیز ہوتی ہے اس کا ـہار الفاظ میں ممکن نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباسؓ مثل نورہ کو مثل نورہ فی قلب المومن (قلب مومن میں اس کے ـی تمثیل) پڑھتے تھے۔ یہ قرأت دراصل تاویل آیت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ کعب بن مالک کا ـبھی اس سلسلہ میں مثل نورہ فی قلب المومن ہی نقل ہوا ہے۔

سعید بن جبیر کی روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا مثل نورہ سے مراد اس نور کی حالت و صفت جو خدا نے مومن کو عطا فرمایا ہے۔

نور کی تمثیل کے اجزاء پر غور کریں تو کئی قیمتی پہلو سامنے آتے ہیں۔ خدا نے اپنے نور کی تمثیل پیش ـہوئے فرمایا کہ ایک چراغ ہے جو طاق میں ہے۔ یعنی بلندی پر ہونے کی وجہ سے اس کی روشنی پورے ـ دور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ انسان کے اندر دل وہ بلند مقام ہے جہاں سے روشنی اس کے سارے ـباطن کو منور کر سکتی ہے۔ پھر چراغ اگر شیشے یا قندیل کے اندر ہو جیسا کہ تمثیل میں فرمایا گیا ہے ـیا طوفان سے اس کے بجھنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ اور اس طرح چراغ کی لو منتشر اور مضطرب بھی ـہوتی اور نہ اس کی تابانی میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے۔

دل کا بھی یہی حال ہے۔ ایمان کی قوت سے اگر وہ ڈانواڈول نہ ہو تو نور حق کے چراغ کے بجھنے ـخوف نہیں رہتا۔ قندیل کے بارے میں فرمایا کہ وہ دمکتے ہوئے تارے کی مانند چمک رہا ہے شیشہ ـہو تو روشنی کے لئے حجاب بن جاتا ہے۔ اسی لئے باطن کی صفائی کی طرف پوری توجہ دینے کی ضرورت ـوس کی گئی ہے۔

پھر تمثیل میں بتایا گیا ہے کہ چراغ مبارک شاداب درخت زیتون کے تیل سے روشن ہوتا ہے۔ ـی ایسا کہ شرقی ہے نہ غربی بلکہ وسط باغ کا ہے۔ ایسے درختوں کے پھل اچھے ہوتے ہیں جن سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل کیا ہوا روغن اتنا شفاف ہوتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ بھڑک اٹھے گا طرح کی خرابیوں سے پاک مومن کی فطرت ہی وہ روغن ہے جو تمازتِ حق سے بھڑکتا اور مومن کے وجو سراپا نور بنا دیتا ہے۔ مومن کی فطرت بذاتِ خود ایک نور ہے۔ یہی نور نورِ حق سے مل کر نورٌ علیٰ بن جاتا ہے۔

پھر تمثیل میں جس طاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ کسی صنمکدے یا مے خانے کا طاق نہیں ہوگا۔ بلکہ ان گھروں کے طاق ہیں جن کے انہدام کا نہیں بلکہ اللہ نے انھیں بلند کرنے کا حکم دیا ہے۔ یعنی جو گھر نہیں بلکہ معابد ہیں جن میں صبح و شام خدا کی تسبیح کی جاتی ہے اور تسبیح کرنے والے بھی ایسے ہیں جو خدا سے غافل نہیں ہوتے۔ خدا کی یاد اور نماز و زکوٰۃ کی ادائیگی سے ان مردانِ خدا کو دنیا کی کوئی مصروفیت نہیں کر سکتی۔ یہ مردانِ خدا وہی ہیں جو خدا سے فضلِ مزید کی امید رکھتے ہیں جس سے خدا انھیں اس نوازے گا جو بڑا ہی سخت دن ہوگا لیکن وہ دن ان مومنوں کے لئے سراپا رحمت بن کر طلوع ہوگا۔ یہ دن تو اصلاً آئے گا ہی اس لئے کہ اہلِ ایمان کو ان کے بہترین اعمال کا صلہ مل سکے۔ اس دن کی طرف حقیقت کے لحاظ سے اپنے صلہ کی طرف بڑھنا ہے۔ حاصل یہ کہ جو قلوب نورِ حق کے لئے مشکوٰۃ کا کام دے رہے ہیں وہ ہر قالب میں نہیں پائے جاتے بلکہ ایسے قلوب تو مومن ہی کے سینے ہو سکتے ہیں۔

اہلِ ایمان کے بالمقابل کفار کا حال یہ ہے کہ ان سے جو کچھ صادر ہوتا ہے اس میں کوئی خیر نہیں ہوتا۔ ان کے اعمال فطرت سے بیگانہ ہوتے ہیں، جب کہ اہلِ ایمان کے اعمال و اخلاق کا تعلق قلب اور فطرت سے ہوتا ہے۔ اس لئے مومن کی تمثیل میں اثرات و اعمال کا ذکر بعد میں کیا گیا۔ موثر کا ذکر فرمایا گیا۔ اس کے برعکس اہلِ کفر کی تمثیل میں اثرات و اعمال کا ذکر پہلے کیا گیا۔ اس ان کے پاس ان کی اپنی بداعمالیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں جس کو نمایاں کرنا ضروری سمجھا جاتا۔

تشبیہ کی بلاغت دیکھیں۔ سراب کے ساتھ قیعۃ کی بھی قید موجود ہے۔ (قیعۃ) ایسے میدان کو کہتے ہیں جہاں حیوانی اور نباتی وجود کا نام و نشان تک نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں محلِ ایسا سنسان صحرا ہے جو بالکل بے آب و گیاہ ہے اور ہر طرح کی نباتی و حیوانی زندگی سے خالی ہے جا رہا ہے کہ جس طرح محلِ سراب زندگی کے آثار اور شادابی سے خالی ہوتا ہے وہی حال کفار کے کا ہے۔ جو بالکل مردہ ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی کی کوئی رمق نہیں پائی جاتی۔ ان کے اعمال کے پیچھے حقیقی شے کی کارفرمائی نہیں ہوتی۔ ان کے اعمال فریبِ محض ہوتے ہیں جن سے کفار توقعات

ہیں لیکن یہ توقعات کبھی پوری ہونے کی نہیں۔

پھر یَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً (پیاسا اسے پانی سمجھتا ہے) کے الفاظ نے تمثیل کو مزید بامعنی ہے۔ اگر پیاس نہ ہو تو پانی کے سراب ثابت ہونے میں چنداں قباحت نہیں لیکن اگر پیاس کی شدت بے تاب شخص سراب کو پانی سمجھ کر اس کے پاس پہونچے اور وہاں کچھ نہ پائے تو اس کی مایوسی کا کیا ہوگا۔ پیاس تو ایک حقیقت ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سراب پانی کا بدل کیسے ہے۔ یہی حال کفار کے اعمال کا ہے۔ یہ اعمال جن پر انھیں بھروسہ ہے، کہ ان کے ذریعہ سے ان کی پیاس بجھ سکے گی فریبِ محض ثابت ہوں گے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ باری تعالیٰ کی تجلی کا ذکر کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم لاکر پیش کی جائے گی جس کی شکل بالکل سراب کی سی ہوگی نصاریٰ سے سوال کیا جائے گا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ وہ کہیں گے: پانی پینا چاہتے ہیں۔ کہا جائے پیو۔ وہ جہنم میں ٹوٹ پڑیں گے۔ ظاہر ہے جہنم میں تشنگی بجھنے کے بجائے اس کی شدت فزوں سے فزوں تر ہوتی جائے گی۔

کفار سے متعلق دوسری تمثیل پر غور کریں۔ اہلِ کفر وہ ہیں جنھوں نے روشنی کے مقابلہ میں تاریکیوں کو پسند کیا۔ وہ گونا گوں تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ جن سے وہ نکلنا بھی نہیں چاہتے۔ گہرا سمندر، موج کے اوپر موج کا اٹھنا اور پھر اوپر گھرے ہوئے بادلوں کا ہجوم جس سے تاریکی حد درجہ بڑھ گئی ہے وحشت ناک منظر ہے۔ کفار تاریکیوں میں ہیں پھر وہ جتنا آگے بڑھتے ہیں تاریکیاں بھی اسی نسبت سے بڑھتی جاتی ہیں۔ غرضیکہ ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے جس کے اندر وہ زندگی گذار رہے ہیں۔

مومن کی زندگی میں نور ہے جو حیات کی علامت ہے اہلِ کفر کا مقدر ظلمت ہے جو بلاؤں اور موت کی ہولناکی کی تصویر ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیں۔ پیاسے کو جہاں پانی نظر آرہا ہے جب وہ وہاں پہنچا تو پانی کی بجائے اس نے خدا کو موجود پایا جس نے حساب چکا دیا کہ سراب کے سوا ان کے حصہ میں کچھ نہیں ہے حساب تو قیامت کے دن ہوگا لیکن قیامت دور نہیں۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ حساب چکانے میں کوئی دیر نہیں۔ اعمال خود اپنے اندر قیامت چھپائے ہوئے ہیں۔ اعمال اپنا انجام اور اپنے اثرات خود اپنے ساتھ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ضرورت صرف نگاہ بصیرت کی ہے جس چیز کو کفار نے دور سمجھا ہے وہ ناممکن ہے اور نہ دور۔ بلکہ ممکن اور بہت ہی قریب ہے۔ دوری حقیقی نہیں اضافی ہے۔ زہر اور موت کے درمیان فاصلہ نہیں۔ زہر کے اندر ہی موت کا سامان موجود ہوتا ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ سورہ نور کی مذکورہ آیات کے چند پہلو ہیں جنھیں اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی بلاغت اور اس میں جو معنوی حقائق بیان ہوئے ہیں ان کا احاطہ کرنا انسانی طاقت و قوت سے باہر کی چیز ہے۔

© rasailojaraid.com